© rasailojaraid.com

حکیم محمود احمد ظفر

ہندوستان میں عیسائیت کی یلغار ۔ قسط ۲

مرزا غلام احمد نے اپنے مخالفین (جن میں جلیل القدر علماء اور عظیم المرتبت مشائخ تھے) ان الفاظ سے یاد کیا اور ان کی ان الفاظ میں ہجو کی اور خاک اڑائی کہ بار بار تہذیب کی نگاہیں نیچی اور حیاء کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ اپنے ان مخالفین کے لئے:

ذریتہ البغایا"

"رنڈیوں کی اولاد" کا کلمہ تو ان کا گویا تکیہ کلام ہے۔

اپنی کتاب انجام آتھم کے ضمیمہ میں لکھتے ہیں:

"اگر یہ گالی دیتے ہیں تو میں نے ان کے کپڑے اتار لئے ہیں اور ان کو ایسا مردار بنا کر چھوڑ دیا ہے جو پہچانا نہیں جاتا"۔ (ص ۱۵۸)

ایک اور جگہ اپنے مخالفین کو اس طرح یاد کرتے ہیں:

"ہمارے دشمن جنگلوں کے خنزیر ہو گئے ہیں اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئی ہیں"۔ (نجم الہدیٰ ص ۱۵)

اپنے ایک حریف مقابل مولانا احمد اللہ لدھیانوی کو بجائے مدلل جواب دینے کے بے نکت گالیاں دیں اور وہ گالیاں بھی عربی نظم میں دیں۔ اپنے زمانہ کے علماء اور شیوخ کو اتنی گالیاں دیں کہ ان کو نقل کرتے ہوئے قلم کو حیاء آتی ہے لیکن مرزا صاحب کو گالیاں دیتے ہوئے حیاء نہ آئی۔ چنانچہ مرزا صاحب کی گالیوں کو حروف تہجی کے حساب سے جمع کر کے "مغلظات مرزا" کے نام سے کتاب تصنیف کی ہے۔

یہاں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کی تردید مقصود نہیں اور نہ ہی مسئلہ ختم نبوت کو بیان کرنا مقصود ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو انگریز نے صرف اس مقصد کے لئے کھڑا کیا اور اس کی سرپرستی بھی کی تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبہ جہاد کو ختم کیا جا سکے۔ کیونکہ یہ جذبہ جہاد سامراجی اور مشنری منصوبوں کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

مختصر یہ کہ قادیانیت کے خدوخال اور اس کے ترکیبی عناصر اسلام اور نبوت محمدی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے خلاف ایک بغاوت تھی جس کی سرپرستی انگریزی حکومت اپنے خاص مقاصد کے پیش نظر کر رہی تھی۔ لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ پورا عالم اسلام سامراجیت کے خلاف میدان کارزار بنا ہوا تھا۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ وغیرہ اکابر علماء نے عملاً جہاد میں حصہ لیا۔ بلکہ کیرانہ کی حیثیت تو اس وقت ایک چھاؤنی کی سی ہو گئی تھی جس کے مجاہدین کا نعرہ یہ تھا "ملک خدا کا اور حکومت مولانا کیرانویؒ کی"۔

سرسید احمد خان:

انگریزوں کا دوسرا آلہ کار سرسید احمد خان تھا جس نے اگرچہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا لیکن انگریزوں کی حمایت میں مرزا غلام احمد سے پیچھے نہ تھا اور دین کے بگاڑنے میں اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اور اگر تحریک علی گڑھ اور تحریک قادیانیت کا جائزہ لیا جائے تو ان دونوں میں کئی باتیں آپس میں مشترک ہیں۔

سرسید احمد خان جو اس تحریک کے علمبردار تھے ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء مطابق ۱۲۳۲ھ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جواد الدولہ سید ہادی شاہ عالم کے زمانہ میں صوبۂ شاہ جہان کے محتسب اور قاضی لشکر تھے۔ ان کے والد میر متقی ایک آزاد طبیعت آدمی تھے اور دنیا داری کے مشغلوں میں کم دلچسپی لیتے تھے۔ وہ مشہور نقشبندی بزرگ شاہ غلام علی کے مرید تھے اور اپنا بیشتر وقت ان کی صحبت یا تیراکی اور تیر اندازی میں جس کے وہ بڑے ماہر تھے صرف کرتے۔ سرسید کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ تھے۔ جو پہلے کمپنی کے مدرسہ کلکتہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور پھر اکبر شاہ ثانی کے وزیر ہو گئے تھے۔ وہ بھی صوفی منش آدمی تھے لیکن سرسید کی تربیت زیادہ تر ان کی والدہ نے کی جو بڑی دانش مند اور دور اندیش خاتون تھیں۔

سرسید کے ابتدائی اثرات میں سے دو باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ایک ان کی ننھیال کے طور طریقے اور دوسرے ان کا مذہبی ماحول، سرسید پر دوسرا بڑا اثر مذہبی تھا۔ اس وقت دہلی میں ترویج مذہب اور علوم اسلامی کے دو بڑے مرکز تھے ایک شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کا مدرسہ دوسرے حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ۔ پہلے میں مسلک ولی اللہی کی پیروی ہوتی تھی اور دوسرے میں طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی۔ سرسید نے ان دونوں سے کسب فیض کیا۔ ان کی ننھیال کو شاہ عبد العزیز اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی اور وہاں اکثر رسوم و امور میں شاہ صاحب کی پیروی ہوتی لیکن سرسید کے والد شاہ غلام علی کے چہیتے مرید تھے لہٰذا سرسید کے تعلقات "خانقاہ" سے بہت گہرے تھے۔ شاہ غلام علی کو اس خاندان سے بڑی محبت تھی۔ اور سرسید اور ان کے بہن بھائی شاہ صاحب کو "دادا حضرت" کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ سرسید کہا کرتے تھے کہ "شاہ صاحب کو ہم سے ایسی محبت تھی جیسی حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے" شاہ غلام علی بھی فرمایا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد رکھا ہے لیکن متقی (سرسید کے والد) کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔ شاہ صاحب ہی نے سرسید کا نام احمد رکھا تھا اور اس کی بسم اللہ کی تقریب بھی شاہ صاحب ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

سرسید کی تعلیم پرانے اسلامی اصولوں پر ہوئی۔ پہلے قرآن حکیم پڑھا۔ پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما، گلستان، بوستان وغیرہ پڑھیں۔ عربی میں شرح ملا جامی، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ ریاضی کا علم اپنے ماموں نواب زین العابدین سے سیکھا اور طب حکیم غلام حیدر خان سے۔ اس کے بعد اپنے طور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر مختلف کتابیں پڑھتے رہے۔ اور ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک جب وہ دہلی کی منصفی پر مامور تھے انہوں نے تحصیلِ علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانے میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ محمد اسحاقؒ اور حضرت مولانا حجتہ الاسلام محمد قاسم نانوتوی کے استاذ اور محسن حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے نام لئے جاتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے یہ نو سال بہت اہم تھے۔ ایک تو انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کر لی دوسرے شاہ جہان آباد کی آخری بہادر کو طفولیت یا عنفوانِ شباب کی نیم وا آنکھوں سے نہیں بلکہ ایک پختہ کار مبصر کی نظر سے دیکھا۔ بہادر شاہ کی حکومت اس وقت اگرچہ قلعہ معلی تک محدود تھی لیکن اس کے دربار میں جو شعراء قصیدے پڑھتے تھے ان میں غالب موجود تھا۔ غالب اور دوسرے اس زمانہ کے باکمال لوگوں کی مجلس میں سرسید کو معیار حاصل تھا۔ سرسید کی علمی اور روحانی تربیت ان باکمال لوگوں کی صحبت میں ہوئی اور انہیں دہلی اور اہلِ دہلی اور اس قوم اور اس کے تمدن سے ایک خاص عشق تھا۔

سرسید کی مذہبی تصنیفات کافی ہیں کیونکہ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کہ "مذہب ہی کی آغوش میں انہوں نے پرورش پائی تھی اور مذہب کی گود میں ہوش سنبھالا تھا" ۱۸۳۹ء سے لے کر جب انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ کے مختصر حالات قلمبند کئے ۱۸۹۸ء تک جب وہ امہات المومنین سلام اللہ علیہن کے متعلق ایک عیسائی مصنف کے اعتراضات کا جواب لکھتے لکھتے وفات پا گئے برابر ساٹھ سال مذہبی مباحث میں ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ انہوں نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ، حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حالات زندگی بڑی عقیدت اور فرط محبت و ادب سے لکھے ہیں۔ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس زمانے میں وہابی مسلمان کہا تھا۔ جب سب وہابی باغی سمجھے جاتے تھے (حیات جاوید ص ۱۲۳) سرسید احمد خان اس قدر پکا وہابی تھا کہ اس نے سید نذیر حسین محدثؒ کو بھی نیم چڑھا وہابی بنا دیا حالانکہ اس سے قبل وہ رفع الیدین وغیرہ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سرسید نے ۱۸۹۵ء میں اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہابی، دوسرے وہابی کریلا، تیسرے وہابی کریلا اور نیم چڑھا۔ میں اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں۔ اور بجز حق، حق، حق جو میرے نزدیک ہو۔ ذرہ برابر دریغ نہیں کرتا۔۔۔۔۔ جناب مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کو میں نے ہی نیم چڑھا وہابی بنایا تھا۔ وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ مگر ان کو سنت ہدیٰ جانتے تھے۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو آپ نیک جانتے ہیں لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے۔ جناب ممدوح میرے پاس تشریف لائے تھے جب یہ گفتگو ہوئی۔ میں نے سنا کہ میرے پاس سے اٹھ کر وہ جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے اور اس وقت سے رفع یدین کرنے لگے گو ان پر لوگوں نے بہت حملے کئے مگر کلمتہ الحق ہمیشہ کلمتہ الحق ہے"۔

سرسید ۱۸۷۰ء میں ولایت سے واپس آئے۔ واپسی پر انہوں نے "کمیٹی خواستگار ترقیٔ تعلیم مسلمانان" قائم کی۔ اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا جائے۔ انگریزوں کی حکومت کو اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلے کی اطلاع دی گئی انہوں نے اس چیز کو بہت پسند کیا کیونکہ جیسا کہ بتایا گیا ہے انگریز اسلامی زبانوں کے بجائے اپنی انگریزی زبان کو ہندوستان میں فروغ دینا چاہتے اور اسی طریقے سے وہ اپنی تہذیب اور کلچر کے مہلک جراثیم مسلمانوں کے قلب و نظر میں ٹھونسنا چاہتے تھے۔

انگریز حکومت نے اخلاقی مدد اور امدادی گرانٹ کے وعدے کے علاوہ لارڈ نارتھ بروک وائسرے و گورنر جنرل ہندوستان نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا۔ سر ولیم میور نے ایک ہزار روپیہ دیا اور دوسرے انگریز افسروں نے بھی مدد کی۔ چنانچہ سر ولیم میور نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اسکول کا باقاعدہ افتتاح کیا۔

سرسید اس زمانے میں بنارس میں تھے چنانچہ اس اسکول کا انتظام مولوی سمیع اللہ خان سیکرٹری علی گڑھ سب کمیٹی کو کرنا پڑا۔ سرسید جولائی ۱۸۷۶ء میں پنشن پا کر علی گڑھ آ مقیم ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا۔

کالج کے قیام میں سرسید کو تمام روشن خیال اور با اثر مسلمانوں کی مدد حاصل تھی۔ لیکن دیندار طبقہ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بعض لوگ اس بارے میں علماء کو دقیانوسی خیالات کا حامل قرار دینے کے لئے یہ بتاتے ہیں کہ علماء نے سرسید کی مخالفت صرف اس وجہ سے کی تھی کہ وہ انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اور علماء اور اسلام کے ساتھ بہت بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے۔ اسلام نے کسی زبان کو سیکھنے سے نہیں روکا۔ چنانچہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ نے جامعہ ملیہ دہلی کے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا تھا۔

"آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے اور دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا"۔

اصل بات یہ ہے کہ علماء نے علی گڑھ کالج کی مخالفت نہیں کی تھی اور نہ ہی انگریزی زبان کی مخالفت کی تھی بلکہ انہوں نے "تحریک علی گڑھ" کی مخالفت کی تھی۔ اور سرسید احمد خان کی مخالفت کی تھی۔ تحریک علی گڑھ ایک داعیہ تھا اور سرسید اس داعیہ کا محرک تھا۔ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید احمد خان کا ہاتھ تھا اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور دینی مسائل کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جو صریحاً اسلام کے خلاف تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور ایسا شخص جو مدرسہ قائم کرنا چاہے اس کی اعانت و امداد جائز نہیں۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کی کتابوں میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف تو کیا موافق بھی بدظن اور مخالف ہو جاتے تھے۔ سرسید نے جب بائیبل کی ناتکمل تفسیر لکھی تو نواب محسن الملک کو اس کی عبارت اتنی شاق گزری کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے انہیں یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

اس تفسیر کے بعد سرسید نے دوسری بے احتیاطی بلکہ بداحتیاطی الفنسٹن کی کتاب "تاریخ ہند" کا ترجمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے وقت کی۔ اس کتاب میں جہاں کہیں مصنف نے جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے وہاں آپ کے متعلق (العیاذ باللہ) "پیغمبر باطل" کا لفظ لکھا ہے۔ سرسید نے بلا کم و کاست یہ لفظ اسی طرح ترجمہ میں لکھ دیا جب کتاب کا یہ حصہ چھپا تو مولوی سمیع اللہ خان اور دوسرے ممبر حضرات نے اس پر اعتراض کیا مولانا حالی نے بھی اس پر اعتراض کیا۔

مخالفت کرنے والے یہ کہتے تھے اور بالکل ٹھیک کہتے تھے کہ ایسے بے ایمان اور پیغمبر علیہ السلام کے مخالف کی کتاب وہ بھی صرف ہندوستان کی تاریخ پر۔ سرسید کو کیا پڑی تھی کہ اس کتاب کا ترجمہ کر کے شائع کرتا۔ اس کتاب میں کون سی خصوصیات تھیں کہ اس کو اس اہتمام سے شائع کیا گیا جس میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس قدر گستاخی کی گئی تھی۔ اگر کوئی انگریز سرسید کے باپ کو کسی کتاب میں جگہ جگہ گالی دیتا تو کیا سرسید اس کتاب کو ترجمہ کر کے ملک کے کونے کونے میں پھیلاتا۔ وہ ہرگز ایسا نہ کرتا۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں پیغمبرِ اسلام کا اتنا بھی احترام نہیں تھا جتنا اپنے باپ کا تھا۔

سرسید نے "تہذیب الاخلاق" جاری کر کے جن خیالات کی نشر و اشاعت کی وہ بھی بالکل غلط تھے اور ان خیالات سے انگریز دوستی اور عیسائیت سے محبت مترشح ہوتی تھی۔ سرسید نے اپنے اس رسالہ میں اسلامی عقائد کے منافی اور ملحدانہ عقائد کا اظہار کیا مثلاً طیور مختنقہ اہلِ کتاب کے کھانے کا جواز رجنہ کے وجود سے انکار، آسمانوں کے بارے میں عام نقطۂ نظر کی تردید، حدیث تشبہ کی صحت سے انکار، معجزات کا تاویلات کے ذریعہ انکار وغیرہ ایسی باتیں اہلِ علم حضرات کو بہت کھٹکیں۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین خطرات درپیش تھے۔ پہلا خطرہ عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھا جو اس امید میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور قریوں میں دندناتے پھر رہے تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو جائے گا۔ اور توحید کے پیرو کار تثلیث کے آگے سرنگوں ہو جائیں گے۔

دوسرا خطرہ انگریزوں کے ان خیالات سے تھا جن کو سن کر بقول سرسید "مرجانے کو جی چاہتا ہے" یہ لوگ اسلام کو عقل اور اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع سمجھتے تھے۔ ان خیالات کے حامل نہ صرف مشنری تھے بلکہ مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وہ انگریز حاکم بھی تھے جنھیں خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت سونپ رکھی تھی۔ اسلام اور بانیٔ اسلام کے متعلق بد ترین کتاب سر ولیم میور کی ہے جو صوبہ جات متحدہ (یو۔پی) کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اور جس نے اپنی کتاب کا خلاصہ دو فقروں میں لکھ دیا ہے کہ "انسانیت کے دو سب سے بڑے دشمن، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن"۔ (۱)

تیسرا خطرہ مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا۔ یہ شکوک و شبہات مشنری

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن" کو انسانیت کا دشمن کہنے والا شخص علی گڑھ کالج کو ایک ہزار روپیہ چندہ دینے والوں میں سے ہے۔ جس کالج کو وہ چندہ دے رہا ہے کیا وہ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عقیدہ یا اس کی کوئی اور چیز چلنے دے گا؟ اور علی گڑھ کا افتتاح بھی اسی کے ہاتھوں ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دوسرے عیسائی مصنفوں اور آزاد خیال مفکروں کی کتابوں سے ڈالے جانے کا خطرہ تھا۔

پہلے خطرہ کا ازالہ تو حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا آل حسن موہانی، ڈاکٹر وزیر خان، مولوی سید ناصر الدین، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور دیگر علمائے اسلام نے کر دیا۔ ان حضرات نے مشنریوں سے مناظرے کئے۔ ان کے مقابلہ میں کتابیں لکھیں، رسائل تقسیم کئے اور ہر طریقہ سے مشنریوں کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر کے ان کے عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

دوسرے اور تیسرے خطرے کا ازالہ بھی علماء اسلام نے اپنے دلائل اور اپنی کتابوں کے ذریعہ فرمایا لیکن سرسید کا خیال ہے کہ یہ کام میں نے کیا ہے یا سرسید نے اس کام کو کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید کی مذہبی تصنیفات کا مقصد مشنریوں کے مقابلے سے زیادہ ان اعتراضات کی تردید تھا جو ولیم میور (WILLIAM MUIR) اور دوسرے مغربی مصنفین اور خود مشنری اسلام پر کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے سرسید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی جس پر عقل، سمجھ اور جدید فلسفے کی رو سے کوئی اعتراض نہ ہوسکے۔ لیکن سرسید کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے عیسائی مصنفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسلام کی ترجمانی نہیں کی۔ بلکہ اس اسلام کی ترجمانی کی ہے جو انگریز چاہتے ہیں یا جو اسلام سرسید کا ہے۔ اور جدید علم الکلام کے نام سے سرسید نے ہر غیر اصلاحی چیز اسلام میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ گویا کہ یہ ایک سازش تھی جو سرسید کے ذریعہ انگریزوں نے اسلام کے خلاف کی۔ مراج، شق صدر، ملائکہ، اجنہ، حساب و کتاب، میزان اور جنت و دوزخ غرض کہ ہر ضروریاتِ دین کا یا تو انکار کیا گیا یا پھر تاویل کی گئی۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سرسید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے۔ مسٹر محمد علی، امیرِ جماعت احمدیہ لاہور (مرزائیوں کے لاہوری گروپ کا امیر) کی تفسیر "بیان القرآن" بیشتر سرسید ہی کی ترجمانی ہے۔ غرض کہ علمائے اسلام نے نہ تو سرسید کے خیالات سے اتفاق کیا نہ ہی سرسید کی تفسیر سے۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ انگریزوں نے تلاش بسیار کے بعد اس شخص کو منتخب کیا تھا لہٰذا اس سے ہر وہ کام کروایا اور اس کے منہ سے ہر وہ بات کہلوائی جو وہ اسلام کے بارے میں کہلوانا چاہتے تھے۔

چنانچہ سرسید کی زندگی ہی میں ان کے بعض عقائد کے خلاف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سرپرست مدرسہ دارالعلوم دیو بند نے رسائل لکھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے لوگوں کو ان کے ساتھ مل کر کام کرنے سے منع کیا۔ ان پرانے علماء نے ہی سرسید کی مخالفت نہ کی بلکہ جن کو تجدد پسندی کا دعویٰ تھا یا جن کو تجدد پسند سمجھا جاتا ہے انہوں نے بھی سرسید کے عقائد اور اس کی تفسیر قرآن بلکہ تحریف قرآن کی شدت سے مخالفت کی۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش ہیں۔ سید اکبر حسین الہ آبادی نے بھی سرسید کے نظریات پر خاصی تنقید کی اور سرسید کے خلاف بہت سی نظمیں بھی لکھیں۔

سید سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا دل میں ذرا اثر نہ رہا لا الہ کا
ہے تجھ سے ترک صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا

© rasailojaraid.com